تحقیقاتی عدالت میں

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بیان تحریری

"تحریک ختم نبوت" کے سلسلہ میں پنجاب میں جو واقعات مارچ ۱۹۵۳ء میں رونما ہوئے ان کی تحقیقات کرنے کے لیے حکومت پنجاب نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ چیف جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم۔ آر کیانی پر مشتمل ایک تحقیقاتی عدالت قائم کی ہے۔ اس عدالت کو حسب ذیل امور کی تحقیق کرنا ہے۔

(۱) فسادات کی ذمہ داری کس پر ہے

(۲) وہ کونسے حالات تھے جو ۶ مارچ کو لاہور میں مارشل لا جاری کیے جانے کے موجب ہوئے۔

(۳) ان فسادات کو روکنے اور بعد میں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صوبائی حکام نے جو تدابیر اختیار کیں اُن کا کافی یا ناکافی ہونا

(۴) جماعت اسلامی کو یہ بھی بتانا تھا کہ ان واقعات میں جماعت اسلامی کا طرز عمل کیا رہا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اس عدالت کے سامنے حسب ذیل تحریری بیان دیا ہے۔

مجھے اپنے بیان میں جو باتیں پیش کرنی ہیں ان کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ مجھ کو عدالت کے Terms of reference کی ترتیب بدل کر سب سے پہلے اُن حالات پر گفتگو کرنی ہوگی جو لاہور میں مارشل لا جاری کیے جانے کے موجب ہوئے۔ اس کے بعد میں اس سوال پر بحث کروں گا کہ ان ہنگاموں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صوبے کے حکام نے جو تدابیر اختیار کیں وہ کیسی تھیں پھر یہ بتاؤں گا

کہ میرے نزدیک ان ہنگاموں کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اور آخر میں عرض کروں گا کہ اس جھگڑے میں میرا اور میری رہنمائی میں جماعت اسلامی کا رویہ کیا رہا ہے۔

۱۔ وہ حالات جو لاہور میں مارشل لا جاری کرنے کے موجب ہوئے

اس سوال کو اگر صرف اُن حالات تک محدود رکھا جائے جو مارشل لا کے اجراء سے پہلے قریبی زمانے میں رونما ہوئے تھے، تو میرے نزدیک یہ اس تحقیقات کا بہت ہی تنگ نقطۂ نظر ہوگا جسے اختیار کر کے کوئی صحیح نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ معاملے کی تہہ کو پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ جس نزاع نے پنجاب میں بالآخر ایک ہنگامے کی شکل اختیار کی، اور جسے فرو کرنے کے لیے مارشل لا نافذ کیا گیا، سب سے پہلے اُس کی اصل اور اس کے تاریخی ارتقاء پر نگاہ ڈالی جائے، اور پھر ان قریبی حالات کو دیکھا جائے جو اس قدیم نزاع کی بدولت حال ہی میں رونما ہوئے۔

(۱) قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا سے ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے خاتمے تک اگرچہ مرزا غلام احمد صاحب مختلف قسم کے دعوے کرتے رہے تھے، جن کی بنا پر مسلمانوں میں ان کے خلاف عام بے چینی پیدا ہو چکی تھی، مگر اس وقت تک انہوں نے کوئی ایک قطعی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں انہوں نے نبوت کا صریح اور قطعی دعویٰ کیا، جس سے ان کے ماننے والوں اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک مستقل نزاع شروع ہو گئی۔

اس نزاع کی وجہ یہ تھی کہ نبوت اسلام کے بنیادی مسائل میں سے ایک ہے۔ ایک شخص کے دعوائے نبوت کے بعد ہر مسلمان کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ اس پر ایمان لانے یا نہ لانے میں سے کسی ایک موقف کا فیصلہ کرے۔ جو لوگ اس پر ایمان لائیں وہ آپ سے آپ ایک الگ امت بن جاتے ہیں اور ان کے نزدیک ایسے سب لوگ کافر ہوتے ہیں جنہوں نے اس کو نہ مانا ہو، اور اس کے برعکس جو لوگ اس پر ایمان نہ لائیں وہ خود بخود متقدم الذکر گروہ سے الگ ایک امت قرار پاتے ہیں اور وہ ایسے سب لوگوں کو کافر سمجھتے ہیں جو ان کے نزدیک ایک جھوٹے نبی پر ایمان لائے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دعوائے نبوت کے بعد سے مرزا صاحب کے ماننے والے اور نہ ماننے والے بالکل ایک دوسرے سے جدا ہوتے چلے گئے۔ مرزا صاحب نے اور ان کے بعد ان کے خلفاء نے

علانیہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں ان تمام لوگوں کو قطعی کافر ٹھیرایا جو ان پر ایمان نہیں لاتے، اور مسلمانوں کے تمام فرقوں نے جن میں سنی، شیعہ، اہل حدیث، حنفی، دیوبندی، بریلوی سب شامل ہیں، بالاتفاق مرزا صاحب کو اور ان سب لوگوں کو کافر قرار دیا جو ان پر ایمان لائے۔

(۲) اس نزاع کو تین چیزیں روز بروز زیادہ تیز کرتی چلی گئیں:-

ایک اس نئے مذہب کے پیرؤوں کی تبلیغی سرگرمی اور بحث و مناظرے کی دائمی عادت جس کی بنا پر ان میں کا ہر شخص اپنے ماحول میں ہمیشہ ایک کشمکش پیدا کرتا رہا ہے۔

دوسرے ان کی تبلیغی سرگرمیوں اور بحثوں اور مناظروں کا زیادہ تر مسلمانوں کے خلاف ہونا جس کی وجہ سے بالعموم مسلمان ہی ان کے خلاف مشتعل ہوئے ہیں۔

تیسرے ان کا مسلمانوں کے اندر شامل رہ کر اسلام کے نام سے تبلیغ کرنا جس کی وجہ سے ناواقف مسلمان یہ سمجھتے ہوئے باسانی ان کے مذہب میں داخل ہو جاتے ہیں کہ وہ ملتِ اسلامیہ سے نکل کر کسی لحد ملت میں نہیں جا رہے ہیں۔ یہ چیز قدرتی طور پر مسلمانوں میں اس سے زیادہ غصہ پیدا کرتی ہے جو عیسائیوں یا کسی دوسرے مذہب والوں کی تبلیغ سے کسی مسلمان کے مرتد ہو جانے پر پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی تبلیغ کسی مسلمان کو اس دھوکے میں مبتلا نہیں کرتی کہ وہ مسلمانوں میں سے نکل کر بھی مسلمانوں ہی میں شامل ہے۔

(۳) آغاز میں یہ نزاع صرف ایک مذہبی نزاع تھی، مگر بہت جلدی اس نے مسلمانوں کے اندر ایک پیچیدہ اور نہایت تلخ معاشرتی مسئلے کی شکل اختیار کر لی۔ اس کی وجہ مرزا صاحب اور ان کے خلفاء کا یہ فتویٰ تھا کہ احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان بس وہی تعلقات رہ سکتے ہیں جو مسلمانوں اور عیسائیوں یا یہودیوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ یعنی ایک احمدی کسی غیر احمدی کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اس کی یا اس کے بچے کی نماز جنازہ نہیں پڑھ سکتا۔ اس کی بیٹی لے سکتا ہے مگر اس کو بیٹی دے نہیں سکتا۔ اس قسم کے کا رد عمل مسلمانوں کی طرف سے بھی ایسے ہی طرز عمل کی صورت میں رونما ہوا۔ اور اس طرح دونوں گروہوں کے درمیان معاشرتی مقاطعے کی حالت پیدا ہو گئی۔ اس مقاطعے سے مسلم معاشرے میں جو تفرقہ رونما ہوا، وہ بس ایک وقتی تفرقہ ہی نہ تھا جو ایک دفعہ رونما ہو کر رہ گیا ہو، بلکہ وہ ایک روز افزوں تفرقہ تھا، کیونکہ قادیانیت ایک تبلیغی تحریک

تھی اور وہ آئے دن کسی نہ کسی مسلمان کو قادیانی بنا کر ایک نئے خاندان میں تفرقہ برپا کر رہی تھی۔ اپنے اس معاشرتی مقاطعے کے رویئے کو لے کر وہ جس گھر، جس خاندان، جس گاؤں، جس برادری، اور جس بستی میں بھی پہنچی، وہاں اس نے پھوٹ ڈال دی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاں شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو اپنے لیے حرام سمجھنے لگیں، یا کم از کم اپنے تعلقات کے جائز ہونے میں شک کرنے لگیں، اور جہاں ایک بھائی کے بچے کی نماز جنازہ دوسرا بھائی نہ پڑھے، اور جہاں بیٹا باپ سے اور باپ بیٹے سے کافروں کا سا معاملہ کرنے لگے، اور جہاں ایک ہی خاندان یا برادری میں رشتے ناطے کے تعلقات ختم ہو جائیں، وہاں معاشرے میں کیسی کچھ تلخیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

یہ تلخیاں قادیانیت کی رفتارِ اشاعت کے ساتھ پچھلے پچاس سال کے دوران میں برابر بڑھتی چلی گئی ہیں، اور سب سے زیادہ پنجاب کو ان سے سابقہ پیش آیا ہے۔ کیونکہ یہاں ہزارہا خاندانوں میں ان کا زہر پھیل چکا ہے۔

(۳) کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کی یہ نزاع معاش کے میدان میں بھی پہنچ گئی۔ مسلمانوں کے ساتھ مذہبی اور معاشرتی کش مکش کی وجہ سے، اور بڑی حد تک نئے نئے مذہبی جوش کی وجہ سے بھی قادیانیوں کے اندر ابتدا ہی سے جتھہ بندی کا ایک زبردست میلان پایا جاتا تھا۔ انہوں نے منظم ہو کر معیشت کے ہر شعبے میں قادیانی کو غیر قادیانی پر ترجیح دینے اور ایک دوسرے کی مدد کر کے آگے بڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا، اور اس سے ان کے اور مسلمانوں کے تعلقات کی تلخی روز بروز بڑھتی گئی۔ خصوصیت کے ساتھ سرکاری ملازمتوں کے معاملے میں دونوں گروہوں کی کش مکش زیادہ نمایاں رہی ہے، اور قادیانی عہدہ داروں کی خویش پروریوں نے اس کو مزید بڑھا دیا ہے۔

اس نزاع سے بھی پنجاب ہی کو سب سے زیادہ سابقہ پیش آیا ہے۔ کیونکہ قادیانیوں کی بڑی تعداد اسی صوبے میں آباد ہے، اور بیشتر یہیں کی زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور ملازمتوں میں ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کش مکش برپا رہی ہے۔ اس موقع پر یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ یہ اسی نوعیت کی نزاع ہے جو اس سے پہلے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے سے پھاڑ کر باہمی عداوت کی آخری حد تک

پہنچا چکی ہے۔

(۵) جہاں دو گروہوں کے درمیان مذہب، معاشرت اور معیشت میں کش مکش ہو، وہاں سیاسی کشمکش کا رونما ہونا بالکل ایک قدرتی بات ہے۔ مگر قادیانیوں اور مسلمانوں کے معاملے میں سیاسی کش مکش کے اسباب اس سے کچھ زیادہ گہرے ہیں۔ مرزا صاحب اور ان کے پیرؤوں کو ابتدا سے یہ احساس تھا کہ جس نبوت کا دعویٰ لے کر وہ اٹھے ہیں، وہ مسلم معاشرے کے اندر کفر و ایمان کی ایک نئی تفریق برپا کرتی ہے اور ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اپنی ملت میں اس طرح کی ایک تفرقہ انگیز قوت Disinregrating force کو مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانے سے لے کر قاچاری اور عثمانی فرماں رواؤں کے دور تک پچھلی بارہ صدیوں میں کبھی اُبھرنے نہیں دیا ہے، اس لیے انہوں نے اپنی تحریک کے آغاز ہی سے انگریزی حکومت کی وفاداری کو اپنا جزوِ ایمان بنایا، اور نہ صرف زبان سے بلکہ پورے خلوص کے ساتھ دل سے بھی یہی سمجھا کہ ان کے نشوونما اور فلاح و کامیابی کا انحصار سراسر ایک غیر مسلم حکومت کے سائۂ عاطفت پر ہے۔ مسلمان غلام ہوں، غیر مسلم ان پر حکمران ہوں، قادیانی ان غیر مسلم حکمرانوں کے پکے وفادار غلام بن کر ان کی حمایت حاصل کریں اور پھر آزادی کے ساتھ بے بس مسلمانوں کو اپنی تفرقہ انگیز تحریک کا شکار بنائیں۔ یہ تھا قادیانیت کی ترقی کا وہ مختصر فارمولا جو مرزا غلام احمد صاحب نے بنایا اور ان کے بعد ان کے خلفاء اور ان کی جماعت کے تقریباً تمام بڑے بڑے مصنفین و مقررین نے اپنی بے شمار تحریروں اور تقریروں میں بار بار دُہرایا۔

قادیانیت کے اس سیاسی رجحان کو ابتداءً انگریز خود اچھی طرح نہیں سمجھے تھے۔ قادیانیوں نے بڑی کوششوں سے انہیں اپنے "امکانات" سمجھائے اور پھر انگریزوں نے ان کو اپنی مسلم رعایا کا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد عنصر سمجھ کر ہندوستان میں بھی استعمال کیا اور باہر دوسرے مسلمان ملکوں میں بھی۔

اس کے بعد جب ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی قومی کشمکش بڑھی، تو کانگریس کے نیشلسٹ لیڈروں کی نگاہ بھی قادیانیت کے "امکانات" پر پڑنی شروع ہو گئی۔ یہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ زمانے کی بات ہے جب کہ ایک بہت بڑے ہندو لیڈر نے قادیانیت کی حمایت میں ڈاکٹر اقبال مرحوم سے مباحثہ فرمایا تھا، اور ایک دوسرے نامور لیڈر نے علانیہ کہا تھا کہ مسلمانوں میں ہمارے نقطۂ نظر سے سب

زیادہ ناپسندیدہ عنصر قادیانی ہیں، کیوں کہ ان کا نبی بھی دیسی Indigenous ہے اور ان کے مقدس مقامات بھی اسی دیس میں واقع ہیں۔

غرض اپنے مسلک خاص کی وجہ سے قادیانیوں کا سیاسی موقف ہی کچھ اس قسم کا کہ غیر مسلم ان کو فطرۃً پُرامید نگاہوں سے اور مسلمان اندیشہ ناک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں ہمیشہ یہ عام خیال موجود رہا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی تخریب کے لیے خود اس ملت کے اندر سے جو عنصر سب سے بڑھ کر دشمنانِ اسلام کا آلۂ کار بن سکتا ہے، وہ قادیانی عنصر ہے اور اس خیال کو جن باتوں نے تقویت پہنچائی ہے، وہ یہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم میں جب بغداد، بیت المقدس اور قسطنطنیہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا، تو پوری مسلم قوم کے اندر رو صرف قادیانی تھے جنہوں نے اس پر خوشیاں منائیں اور چراغاں کیے۔ یہی نہیں بلکہ قادیانیوں کے خلیفہ صاحب نے علی الاعلان یہ فرمایا کہ انگریزی حکومت کی ترقی سے ہماری ترقی وابستہ ہے۔ جہاں جہاں یہ پھیلے گی ہمارے لیے تبلیغ کا میدان نکلتا آئے گا۔ ان باتوں کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قادیانیوں کے متعلق مسلمانوں کی عام بدگمانی بے وجہ ہے۔

(۶) تمام مسلمانوں کی تکفیر اور ان سے معاشرتی مقاطعہ اور ان کے ساتھ معاشی کش مکش کی بنا پر قادیانیوں اور مسلمانوں کے تعلقات میں جو تلخی پیدا ہو چکی تھی، اس کو مرزا غلام احمد صاحب اور ان کے پیروؤں کی ان بہت سی تحریروں نے تلخ تر بنا دیا تھا جو مسلمانوں کے لیے سخت دل آزار اور اشتعال انگیز تھیں۔ مثال کے طور پر ان کی چند عبارتیں حسبِ ذیل ہیں جن کو دیکھ کر عدالت خود اندازہ کر سکتی ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ان باتوں کو برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے:۔

"ایک غلطی کا ازالہ (اشتہار) میں حضرت مسیح موعود نے فرمایا کہ محمد الرسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم کے الہام میں محمد الرسول اللہ سے مراد میں ہوں اور محمد الرسول اللہ خدا نے مجھے کہا ہے"

(اخبار الفضل، قادیان ج ۲، ص۱، مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۵ء)

"پس ظلی نبوت نے مسیح موعود کے قدم کو پیچھے نہیں ہٹایا بلکہ آگے بڑھایا اور اس قدر آگے

بڑھایا کہ نبی کریم کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا۔"

("کلمۃ الفصل" مصنفہ صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب قادیانی۔

مندرجہ رسالہ ریویو آف ریلیجنز، ج ۱۴، عدد ۳، ص ۱۱۳)

"اس کے (یعنی نبی کریم کے) لیے چاند گرہن کا نشان ظاہر ہوا، اور میرے لیے چاند اور سورج دونوں کا۔ اب کیا تو انکار کرے گا؟"

("اعجاز احمدی" مصنفہ مرزا غلام احمد صاحب، ص ۷۱)

محمد پھر اُتر آئے ہیں ہم میں — اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شان میں
محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل — غلام احمد کو دیکھے قادیاں میں

(از قاضی محمد ظہور الدین اکمل قادیانی۔ منقول از اخبار "پیغام صلح" لاہور

۱۴ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء)

"مجھ میں اور تمہارے حسین میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ مجھے تو ہر ایک وقت خدا کی تائید اور مدد مل رہی ہے۔" ("نزول المسیح"، مصنفہ مرزا غلام احمد صاحب، ص ۹۶)

"اور میں خدا کا کشتہ ہوں اور تمہارا حسین دشمنوں کا کشتہ ہے۔"

("نزول المسیح" مرزا غلام احمد صاحب، ص ۸۱)

کربلائیست سیر ہر آنم — صد حسین است در گریبانم

(مرزا غلام احمد صاحب، منقول از خطبہ جمعہ میاں محمود احمد صاحب

مندرجہ "الفضل" قادیان ج ۱۲، عدد ۸۰ مورخہ ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء)

"ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو — اس سے بہتر غلام احمد ہے۔"

("دافع البلاء"، ص ۲۰)

"یسوع کے ہاتھ میں سوائے مکر و فریب کے اور کچھ نہیں تھا۔ پھر افسوس کہ یہ نالائق عیسائی ایسے شخص کو خدا بنا رہے ہیں۔ آپ کا خاندان بھی نہایت پاک اور مطہر ہے۔ تین دادیاں اور نانیاں

آپ کی زناکار اور کسبی عورتیں تھیں جن کے خون سے آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا۔"

(ضمیمہ انجام آتھم" ص ۷ ۔ "نور القرآن" ۲۔ ص ۱۲)

"جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہوگا اور تیرا مخالف رہے گا، وہ خدا اور رسول کی مخالفت کرنے والا جہنمی ہے"

(الہام مرزا غلام احمد صاحب، "تبلیغ رسالت" ج ۹، ص ۲۷)

"کل مسلمانوں نے مجھے قبول کر لیا ہے اور میری دعوت کی تصدیق کر لی ہے، مگر کنجریوں اور بدکاروں کی اولاد نے مجھے نہیں مانا"

(آئینہ کمالات، ص ۵۴۷)

"جو شخص میرا مخالف ہے وہ عیسائی، یہودی، مشرک اور جہنمی ہے"

(نزول المسیح، ص ۴ ۔ تذکرہ، ص ۲۲۷ ۔ تحفہ گولڑویہ، ص ۳۱ تبلیغ رسالت ج ۹ ص ۲۷)

"بلاشبہ ہمارے دشمن بیابانوں کے خنزیر ہو گئے اور ان کی عورتیں کتیوں سے بھی بڑھ گئیں"

(نجم الہدیٰ" ص ۱۰ ۔ "درثمین" ص ۲۹۴)

"جو شخص ہماری فتح کا قائل نہ ہوگا تو صاف سمجھا جائے گا کہ اس کو ولد الحرام بننے کا شوق ہے"

(انوار الاسلام، ص ۳۰)

(۷) یہ اسباب نصف صدی سے مسلسل اپنا کام کر رہے تھے اور انہوں نے خاص طور پر پنجاب میں قادیانیت کو مسلمانوں کے لیے ایک ایسا مسئلہ بنا دیا تھا جو چاہے کوئی بڑا مسئلہ نہ ہو، مگر احساس کے لحاظ سے ایک نہایت تلخ مسئلہ ضرور تھا جس کی تلخی کو شہروں اور دیہات کے لاکھوں آدمی یکساں محسوس کر رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تلخی اس سے پہلے کسی بڑے ہنگامے کی محرک نہ بنی تھی، مگر پچھلے تیس چالیس سال کے دوران میں وہ برابر چھوٹے چھوٹے گھریلو، خاندانی اور مقامی جھگڑے برپا کرتی رہی تھی، جو بارہا عدالتوں تک بھی فوجداری اور دیوانی مقدمات کی صورت میں پہنچے ہیں۔ مسلمانوں کے اونچے طبقے چاہے اس میں شریک نہ رہے ہوں، مگر عوام اور نچلے متوسط طبقے میں ایک مدت سے یہ عام خواہش موجود رہی ہے کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے، تاکہ انہیں مسلمانوں کے

معاشرے میں شامل رہ کر اپنی تبلیغ سے اس معاشرے کے اجزاء کو آئے دن پارہ پارہ کرتے رہنے کا موقع تو نہ ملے۔ مسلمانوں کی اسی خواہش کی ترجمانی اب سے تقریباً بیس برس پہلے علامہ اقبال مرحوم نے اپنے رسالہ Islam and Ahmadism میں فرمائی تھی اور اس کے حق میں بڑے مضبوط دلائل دیئے تھے۔

(۸) انگریزی دور میں مسلمان اس کی بہت کم امید رکھتے تھے کہ وہ قادیانیوں کو اپنے سے الگ کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو سکیں گے۔ کیوں کہ ایک بیرونی قوم سے قدرتی طور پر یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے ایک معاشرتی مسئلے کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے اور حل کرنے کی زحمت اٹھائے گی اور مسلمانوں کو یہ بھی احساس تھا کہ انگریز قادیانیوں کو قصداً مسلمانوں کے اندر شامل رکھنا چاہتے ہیں تاکہ بوقت ضرورت مسلم مفاد کے خلاف ان کو آسانی سے استعمال کیا جاسکے۔ مگر جب پاکستان ایک خود مختار ریاست کی حیثیت سے وجود میں آگیا، تو مسلمانوں نے بجا طور پر اپنی قومی حکومت سے یہ توقع وابستہ کی کہ وہ دوسرے مسائل کی طرح قادیانیت کے مسئلے کی طرف بھی توجہ کرے گی، جو پچاس برس سے ان کی ملت میں مسلسل تفرقہ برپا کر رہی ہے، اور جس کی بدولت ایک ہی قوم کے اندر دو ایسے عنصر پیدا ہو رہے ہیں جو مذہبی، معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے باہم متصادم اور نبرد آزما ہیں۔ پاکستان کی عمر کے ساتھ ساتھ یہ توقع بڑھتی اور پھر بتدریج مایوسی اور بے چینی اور شکایت کی حد تک پہنچتی چلی گئی۔ میں نے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں تقریباً پورے پنجاب کا دورہ کیا ہے اور شہروں کے علاوہ دیہاتی علاقوں تک میں گیا ہوں، اس پورے دورے میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں مجھ سے قادیانیت کے بارے میں سوال نہ کیا گیا ہو۔ میں نے اسی وقت یہ محسوس کر لیا تھا کہ جس مسئلے کے متعلق عام لوگوں کے دلوں میں یہ احساسات موجود ہوں، اس کو اگر حل نہ کیا گیا تو وہ کبھی نہ کبھی ملک میں ایک فتنہ اٹھا کر رہے گا۔

(۹) قیام پاکستان کے بعد خود قادیانیوں کی طرف سے بھی پے در پے ایسی باتیں ہوتی رہی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی تشویش میں مزید اضافہ کر دیا اور مسلمان یہ محسوس کرنے لگے کہ قادیانی مسئلہ انگریزی دور سے بھی بڑھ کر ان کے لیے اب ایک خطرناک مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز

کر کے میں صرف پانچ اہم باتوں کی طرف عدالت کو توجہ دلاؤں گا۔

اوّل یہ کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب نے ۲۳ جولائی ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ وہ بلوچستان کو ایک قادیانی صوبے میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں، تاکہ پورے پاکستان پر قبضہ کرنے کے لیے وہ ایک Base کے طور پر کام آئے۔ یہ خطبہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کے "الفضل" میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ مرزا صاحب نے اس خیال کو صرف ایک وقتی خواہش کے طور پر ہی ظاہر نہیں کیا ہے، بلکہ وہ اس کا بار بار اعادہ کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ۵ جولائی ۱۹۵۰ء کے "الفضل" میں ان کا ایک خطبہ اسی خیال کا حامل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مستقل منصوبہ ہے جو ان کے ذہن میں پکتا رہا ہے۔

دوم یہ کہ انھوں نے اپنے اس منصوبے کا بھی بار بار علی الاعلان اظہار کیا ہے کہ باقاعدہ ایک منظم کوشش کے ساتھ مختلف سرکاری محکموں میں قادیانیوں کو داخل کیا جائے، اور پھر سرکاری عہدوں پر قبضہ کر کے حکومت کی مشینری کو قادیانی جماعت کے مفاد میں استعمال کیا جائے۔ اس کی مثال میں خلیفہ صاحب کے صرف ایک خطبے کی حسب ذیل عبارت نقل کر دینا کافی ہے:

"اگر وہ (یعنی قادیانی جماعت کی صوبائی شاخیں)، اپنے نوجوانوں کو دنیا کے کمانے پر لگائیں، تو اس طرح لگائیں کہ جماعت اس سے فائدہ اُٹھا سکے۔ بھیڑ چال کے طور پر نوجوان ایک ہی محکمے میں چلے جاتے ہیں، حالانکہ متعدد محکمے ہیں جن کے ذریعے سے جماعت اپنے حقوق حاصل کر سکتی ہے اور اپنے آپ کو شر سے بچا سکتی ہے۔ جب تک ان سارے محکموں میں ہمارے اپنے آدمی موجود نہ ہوں، ان سے جماعت پوری طرح کام نہیں لے سکتی۔ مثلاً موٹے موٹے محکموں میں سے فوج ہے، پولیس ہے، ایڈمنسٹریشن ہے، ریلوے ہے، فائی ننس ہے، اکاؤنٹس ہے، کسٹم ہے، انجینئرنگ ہے۔ یہ آٹھ دس موٹے موٹے صیغے ہیں جن کے ذریعے سے ہماری جماعت اپنے حقوق محفوظ کر سکتی ہے۔ ہماری جماعت کے نوجوان فوج میں بے تحاشا جاتے ہیں، اس کے نتیجے میں ہماری نسبت فوج میں دوسر

محکموں کی نسبت بہت زیادہ ہے، اور اس سے ہم اپنے حقوق کی حفاظت کا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ باقی محکمے خالی پڑے ہیں بے شک آپ اپنے لڑکوں کو نوکر کرائیں لیکن وہ نوکری اس طرح کیوں نہ کرائی جائے جس سے جماعت فائدہ اٹھا سکے . . . . . . ہمیں اس بارے میں خاص پلین Plan بنانا چاہئے اور پھر اس کے مطابق کام کرنا چاہیے"

(الفضل مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء)

سوم یہ کہ خلیفہ صاحب قیام پاکستان کے بعد سے اپنے پیروؤں کو مسلسل "دشمنوں" کے مقابلے پر اکسلتے اور بھڑکاتے رہے ہیں۔ اور ان کے اندر ایک جنگ جویانہ ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ایک خطبے کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"لوگ گھبراتے ہیں کہ ان کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے۔ لوگ جھنجھلا اٹھتے ہیں کہ ان کی عداوت کیوں کی جاتی ہے۔ لوگ چڑتے ہیں کہ انہیں دکھ کیوں دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر گالیاں دینے اور دکھ دینے کی یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارا شکار ہیں، تو پھر ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے اور نہ کسی قسم کا فکر کرنا چاہیے۔ بلکہ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ دشمن یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر ہم میں کوئی نئی حرکت پیدا ہوئی تو ہم اس کے مذہب کو کھا جائیں گے" (الفضل ۴ جولائی ۱۹۵۲ء)

صریح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ اس عبارت میں "لوگ" سے مراد قادیانی ہیں، "دشمن" سے مراد مسلمان ہیں۔ مرزا صاحب مسلمانوں کو اپنا شکار قرار دے رہے ہیں اور اس بات پر مسرت کا اظہار فرما رہے ہیں کہ مسلمان ان کی تحریک کو اپنے مذہب کے لیے تباہ کن خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ ایسے ہی جنگ جویانہ خطبے ۵ جولائی ۱۹۵۰ء اور ۷ مئی سنہ کے "الفضل" میں بھی موجود ہیں۔

چہارم یہ کہ قادیانی جماعت کی طرف سے جارحانہ ارادوں کا اظہار صرف جنگ جویانہ باتوں ہی کی شکل میں نہیں بلکہ عملی تدابیر کی شکل میں بھی ہوتا رہا ہے، جن کی خبریں عام طور پر مسلمانوں میں پھیل کر اضطراب پیدا کرتی رہی ہیں۔ مثلاً فوج میں "فرقان بٹالین" کے نام سے خالص قادیانیوں پر مشتمل ایک بٹالین کا قیام، قادیانیوں کے پاس اسلحہ سازی کے متعدد کارخانے ہونا، اور قادیانیوں کو

اسلحہ کے بکثرت لائسنس حاصل ہونا۔ ان چیزوں کو قادیانیوں نے خود ہی عوام کے سامنے بیان کر کرکے اپنا رُعب بٹھانے کی کوشش کی ہے۔

پنجم یہ کہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب اور ان کی جماعت کے دوسرے لوگوں نے ۱۹۵۲ء کے آغاز سے مسلمانوں کو کھلم کھلا دھمکیاں دینی شروع کر دیں، جن کا لہجہ روز بروز اشتعال انگیز ہوتا چلا گیا۔ مثال کے طور پر ان کی حسب ذیل عبارتیں ملاحظہ ہوں:-

"ہم فتح یاب ہوں گے۔ ضرور تم مجرموں کی طرح ہمارے سامنے پیش ہو گے۔ اس وقت تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو فتح مکہ کے دن ابوجہل اور اس کی پارٹی کا ہوا"

("الفضل" ۳ جنوری ۱۹۵۲ء)

"۱۹۵۲ء گزرنے نہ دیجیے جب تک کہ احمدیت کا رعب دشمن اس رنگ میں محسوس نہ کر لے کہ اب احمدیت مٹائی نہیں جا سکتی۔ اور وہ مجبور ہو کر احمدیت کی آغوش میں نہ آگرے" ("الفضل" ۱۶ جنوری ۱۹۵۲ء)

"ہاں اب آخری وقت آ پہنچا ہے اُن تمام علمائے حق کے خون کا بدلہ لینے کا جن کو شروع سے لے کر آج تک یہ خونی مُلّا قتل کراتے آئے ہیں۔ ان سب کے خون کا بدلہ لیا جائے گا:-

(۱) عطاء اللہ شاہ بخاری سے،

(۲) مُلّا بدایونی سے،

(۳) مُلّا احتشام الحق سے،

(۴) مُلّا محمد شفیع سے،

(۵) مُلّا مودودی (پانچویں سوار) سے۔" ("الفضل" ۱۵ جولائی ۱۹۵۲ء)

(۱۰) یہ ہے حالات کا وہ تاریخی پس منظر جس میں احرار نے قادیانی مسئلے پر ایجی ٹیشن کا آغاز کیا۔ میری سابق تصریحات سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ مسئلہ فی الواقع پنجاب میں موجود تھا

اور عوام کے اندر اس کے بارے میں اتنی بے چینی بھی موجود تھی کہ اسے ایک فتنہ بننے کے لیے بس کسی نہ کسی کے چھیڑ دینے کی ضرورت تھی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ احرار ہی کیوں تھے جنہوں نے اسے چھیڑا؟ اس کے بارے میں آج حکومت کی طرف سے جو نظریات پیش کیے جا رہے ہیں، میں ان کو سراسر افترا اور اخلاقی پستی کی انتہا سمجھتا ہوں۔ درحقیقت جو لوگ بھی اس ملک کی تحریکات سے براہِ راست واقفیت رکھتے ہیں، وہ اس امر واقعی سے آگاہ ہیں کہ احرار کے لیے اس مسئلے سے تعرض کرنے کا یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ پچھلے پچیس سال سے وہ قادیانیوں کے خلاف تقریریں کرتے رہے ہیں اور یہ بحث ان کی دلچسپیوں کا خاص موضوع رہی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب ۱۹۴۹ء میں احرار نے اپنے پچھلے سیاسی مسلک سے توبہ کی اور اپنی سیاست کو مسلم لیگ کی سیاست میں مدغم کرنے کا اعلان کیا، اس وقت انہوں نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ آئندہ وہ جماعتی حیثیت سے اپنی جدوجہد کو صرف "تحفظِ ختمِ نبوت" پر مرکوز رکھیں گے۔ اس کے بعد سے ۵۲ء تک وہ مسلم لیگ کے سیاسی حلیف رہے۔ پنجاب اور بہاولپور کے انتخابات میں انہوں نے لیگ کا پورا ساتھ دیا۔ پاکستان کے دونوں سابق وزیر اعظم (مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم اور خواجہ ناظم الدین) مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے ان کی خدمات کا فائدہ اٹھاتے رہے۔ انتخابی جلسوں میں بارہا احرار نے مرکزی وزراء اور پنجاب و بہاولپور کے وزراء کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر تقریریں کی ہیں، اور خود ان تقریروں میں بھی انہوں نے قادیانی مسئلے پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس پوری مدت میں ہم نے کبھی نہیں سنا کہ احراری اپنی سابق کانگریسیت کی وجہ سے پاکستان کی تخریب کے درپے ہیں، یا باہر کی طاقتوں سے ان کا کوئی ساز باز ہے۔ مگر جب انہوں نے حکمران پارٹی کی مرضی کے خلاف یہ تازہ ایجی ٹیشن شروع کیا تو یکایک وہی پارٹی، جس کے یہ احرار کل تک سیاسی حلیف تھے، اپنے سرکاری بیانات میں ہمیں یہ خبر دینے لگی کہ یہ لوگ تو کبھی پاکستان کے قیام سے راضی ہی نہیں ہوئے، اور انہوں نے محض دشمنوں کے اشارے پر پاکستان کی تخریب کے لیے یہ قادیانی مسئلہ چھیڑا ہے۔ میں اپنی پبلک لائف کے آغاز سے احرار کا سیاسی مخالف رہا ہوں اور میرا ان کے ساتھ کبھی کوئی حلیفانہ تعلق نہیں رہا ہے۔ مگر انصاف و دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ میں

غداری اور بیرونی طاقتوں کے ساتھ سازباز کے ہر اس الزام کو، جو میرے ملک کے کسی شہری پر لگایا جائے، اس وقت تک جھوٹا سمجھوں جب تک کہ اس کا ثبوت کسی کھلی عدالت میں دے کر مجرم کو اس کے جرم کی سزا نہ دلوا دی جائے۔ ثبوت اور شہادت کے بغیر کسی شخص یا جماعت کے خلاف اس طرح کے گھناؤنے الزامات لگانا میرے نزدیک سخت ناجائز ہے اور میں اس کو روسیوں کی ایک بہت ہی مکروہ تقلید سمجھتا ہوں۔ اس لیے جب تک کوئی دوسری بات ثابت نہ ہو، میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ احرار نے قادیانیوں کے خلاف جو ایجی ٹیشن شروع کیا، وہ ان کے پچھلے پچیس سالہ جماعتی مسلک کا ایک قدرتی تقاضا تھا۔ مسلم پبلک میں قادیانیوں کے متعلق جو جذبات اور مطالبات موجود تھے، ان کو ایک تحریک کے راستے پر ڈالنے کے لیے اس ملک میں اگر کوئی جماعت تھی، تو وہ احراری جماعت ہی ہو سکتی تھی۔

(۱۱) میری اوپر کی تصریحات سے حکومت اور اس کے حامیوں کے اس قیاس کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مسئلہ محض مصنوعی طور پر احرار کے اکسانے سے اچانک اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہ قیاس نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے بلکہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ واقعات سے قطع نظر محض عقلی حیثیت سے بھی اگر دیکھا جائے، تو یہ بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جماعت، خواہ وہ کیسی ہی مقبول اور طاقتور کیوں نہ ہو، کسی ملک کی عام آبادی کو کسی ایسے مسئلے پر بھڑکا سکے جس کے لیے خود اس آبادی میں حقیقی احساسات موجود نہ ہوں۔ جماعتیں مسئلے پیدا نہیں کر سکتیں، وہ صرف موجود مسائل میں سے کسی مسئلے کو لے کر اس کے متعلق عوام کے دبے ہوئے احساسات کو ابھار سکتی ہیں، یا ابھرے ہوئے احساسات کو عمل کا رستہ بتا سکتی ہیں۔ رہا اس مسئلے کا واقعاتی پہلو، تو درحقیقت وہ سرکاری نظریے کے بالکل برعکس صورت واقعہ پیش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ احرار اپنی سابق کانگریسیت کی وجہ سے مسلمانوں میں سخت غیر مقبول ہو چکے تھے، اور ان کی یہ حیثیت ہرگز نہ رہی تھی کہ اپنے بل بوتے پر اس ملک میں کوئی عام تحریک برپا کر سکتے۔ مگر قادیانیوں کے مسئلے میں مسلمانوں کے عام احساسات اتنے تلخ تھے کہ احرار جیسی غیر مقبول جماعت بھی جب ان کی مانگ

پوری کرنے کے لیے آگے بڑھی، تو شہروں اور دیہات کے لاکھوں عوام ان کے پیچھے لگ گئے۔

(۱۲) حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ ۱۸ مئی ۱۹۵۲ء کو قادیانی جماعت نے جہانگیر پارک کراچی میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا اور اس میں سر محمد ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ پاکستان نے اعلانیہ شریک ہو کر تقریر کی۔ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد یہ پہلا موقع تھا جب قادیانیوں نے علی الاعلان پبلک جلسہ کر کے اور عام لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دے کر ان کے سامنے اپنے مسلک کو پیش کرنے کی جرأت کی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے وہ یا تو اپنی جماعت ہی کے جلسے کیا کرتے تھے، یا پھر مناظرے کی مجلسوں میں ان کو عوام کے سامنے اپنی بات کہنے کا موقع ملتا تھا۔ اس جرأت کے اظہار سے مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ اب سر ظفر اللہ خاں اپنی وزارت کا رعب ڈال کر ہم کو قادیانیت کی دعوت دینا چاہتے ہیں۔ اس پر کراچی میں ایک بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا جسے ختم کرنے کے لیے پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔

یہ تھا وہ شاخسانہ جس نے تمام ملک میں اور خصوصاً پنجاب میں آگ لگا دی، اور اس سے قادیانی مسئلے کے متعلق پبلک ایجی ٹیشن کا آغاز ہوا۔ اس ایجی ٹیشن کی ابتدا کرنے والے بلاشبہ احرار تھے، مگر بہت جلدی یہ احرار کا نہیں بلکہ عام مسلمانوں کا ایجی ٹیشن بن گیا۔ اس موقع پر احرار نے جو مطالبات پیش کیے اور جن کی تائید میں ملک کے گوشے گوشے سے، خصوصاً پنجاب کے قریے قریے سے آواز اٹھنی شروع ہو گئی وہ یہ تھے:-

"(۱) قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے،

(۲) سر ظفر اللہ خاں کو وزارت خارجہ سے ہٹایا جائے،

(۳) ربوہ میں جو سرکاری زمین قادیانیوں کو کوڑیوں کے مول دی گئی ہے، وہ واپس لی جائے،

(۴) قادیانیوں کو کلیدی عہدوں سے ہٹایا جائے۔

(۱۳) مئی ۱۹۵۲ء میں احرار نے پہلی مرتبہ قادیانیوں کے خلاف عام ایجی ٹیشن شروع کیا۔ حکومت نے اس وقت جگہ جگہ دفعہ ۱۴۴ لگا کر، لاٹھی چارج کر کے، ائمہ مساجد پر دباؤ ڈال کر اسے دبانے کی کوشش کی، حتیٰ کہ ملتان میں فائرنگ کی نوبت بھی آئی۔ اس وقت سے لے کر مارچ ۱۹۵۳ء کے آغاز تک میں نے اور جماعت اسلامی نے حکومت کو بار بار یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ قادیانی مسئلہ ایک مصنوعی مسئلہ نہیں ہے

بلکہ ایک حقیقی مسئلہ ہے جس کے نہایت گہرے مذہبی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی اسباب ہیں اور یہ اسباب پچاس سال سے کام کر رہے ہیں، اور پنجاب کے لاکھوں مسلمانوں کی زندگی ان سے متاثر ہے، لہٰذا اس کو اوپر سے دبانے کے بجائے اسے سمجھیے اور ٹھنڈے دل و دماغ سے حل کرنے کی کوشش کیجیے۔ اس کے ثبوت میں میرے وہ مضامین، بیانات اور پمفلٹ اور جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے رزولیوشن موجود ہیں، جو ماہ جون سے مارچ تک پے در پے شائع ہوتے رہے۔ میں نے پاکستان کی مجلس دستور ساز کو اگست، ستمبر ۱۹۵۲ء میں یہ مشورہ بھی دیا کہ جو دستور اس وقت زیر ترتیب ہے، اس میں جس طرح دوسری اقلیتوں کے لیے جداگانہ انتخاب اور نشستوں کا تعین تجویز کیا جا رہا ہے، اسی طرح قادیانیوں کے لیے بھی کر دیا جائے، تاکہ مسلمانوں کی بے چینی رفع ہو جائے اور یہ مسئلہ خواہ مخواہ کسی ہنگامے کا موجب نہ بن سکے۔ یہی رائے جنوری ۱۹۵۳ء میں پاکستان کے ۳۳ سربرآوردہ علماء کی اس مجلس نے بھی دی جو کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔ لیکن حکومت نے نہ صرف یہ کہ ان مشوروں کی طرف کوئی توجہ نہ کی، بلکہ اس نے خود اپنی طرف سے بھی اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ اس کا رویہ اول روز سے یہی رہا کہ یہ مسئلہ صرف حقارت کے ساتھ رد کر دینے ہی کے قابل ہے؟ اس قابل نہیں ہے کہ اسے سمجھا اور حل کیا جائے۔

(۱۴) مئی ۵۲ء کے بعد سے مسلسل کئی مہینے تک پنجاب اور بہاولپور کے جہاں کا درحقیقت یہ معاشرتی و معاشی مسئلہ تھا، ہر حصے میں اس مسئلے کے متعلق بلا مبالغہ ہزاروں جلسے ہوئے، مسلم پبلک کے مطالبات ریزولیوشنوں کی شکل میں پاس ہوتے، حکومت کے پاس وفود بھی گئے، جنہوں نے براہ راست یہ مطالبات وزیر اعظم کے سامنے پیش کیے، مگر ان ساری کوششوں کا جو نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ ۲۲ دسمبر ۵۲ء کو جو B. P. C. Report شائع ہوئی، اس میں سرے سے قادیانی مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اس چیز نے اس غیر آئینی طریق کار کے لیے زمین ہموار کی جو بعد میں احرار نے ڈائرکٹ ایکشن کی شکل میں تجویز کیا۔ میں اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنا پر یہ جانتا ہوں کہ مسلمان فطرۃً شورش پسند نہیں ہیں، اور پاکستان کے مسلم عوام تو خصوصیت کے ساتھ یہ احساس رکھتے ہیں کہ خطرات کے درمیان گھرے ہوئے اس ملک میں امن و انتظام کو درہم برہم کرنے والی کوئی تحریک مناسب نہیں ہے۔ اس لیے میں

پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر ایک پبلک مطالبے کو، جس کے بارے میں لوگوں کے اندر تلخ احساسات موجود تھے، یوں حقارت کے ساتھ مسلسل نہ ٹھکرایا جاتا، اور لوگوں کو آئینی طریقہ کار سے مایوس نہ کر دیا جاتا، تو کوئی جماعت بھی یہاں کے عوام کو ڈائرکٹ ایکشن اور قانون شکنی پر آمادہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔

(۱۵) اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ جن باتوں نے لوگوں کے درمیان عام ناراضی پیدا کی وہ یہ تھیں:

اوّل یہ کہ حکومت نے اس پوری مدت میں کبھی زبان کھول کر لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ اگر وہ ان کے مطالبات قبول نہیں کرتی ہے تو آخر اس کے وجوہ کیا ہیں۔ ایک طرف عوام کی طرف سے مسلسل ایک مطالبہ ہو اور عوام جذباتی حیثیت سے اس پر مشتعل ہی نہ ہوں بلکہ دلائل کی بنا پر مطمئن بھی ہوں کہ ان کا مطالبہ معقول ہے۔ دوسری طرف حکومت کوئی وجہ بتلائے بغیر اس کو بس یونہی ٹھکرا دے اور عوام کو دلائل سے یہ سمجھانے کی کوئی کوشش نہ کرے کہ ان کا مطالبہ کیوں قابل قبول نہیں ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ عوام اس روش کو حکومت کی ہٹ دھرمی اور ہیکڑی سمجھیں اور ان کے اندر اس کے خلاف غصہ پیدا ہو جائے۔ یہ ڈھنگ ڈکٹیٹر شپ میں تو چل سکتے ہیں مگر ایک جمہوری نظام میں خود اپنے بنائے ہوئے حکمرانوں کی طرف سے یہ سلوک برداشت کرنا عوام کے لیے ممکن نہیں ہے۔

دوم یہ کہ حکومت نے ڈائرکٹ ایکشن کا اعلان ہو جانے کے بعد جب زبان کھولی تو ایسے غلط طریقے سے کھولی جو لوگوں کو مطمئن کرنے کے بجائے الٹا اور اشتعال دلانے والا تھا۔ ڈائرکٹ ایکشن کی تحریک کے لیڈروں کو گرفتار کرتے ہوئے جو سرکاری کمیونک شائع کیا گیا اور اس کے بعد مارشل لا کے اجرا کے وقت جو دوسرا کمیونک کراچی سے شائع ہوا، ان دونوں میں مخالف احمدیت تحریک کو مسلمانوں کی وحدت ملی میں تفرقہ ڈالنے والی تحریک قرار دیا گیا تھا۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے اشتعال انگیز بھی تھی اور بجائے خود نامعقول بھی۔ اشتعال انگیز اس لیے کہ اس میں گویا سرکاری طور پر احمدیوں کے ملت اسلامیہ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ مسلمانوں نے کبھی ان کو اپنی ملت کا جزو نہیں مانا ہے اور تمام اسلامی فرقوں کے علماء بالاتفاق ان کو خارج از ملت قرار دے چکے ہیں۔ نامعقول اس لیے کہ حکومت جس چیز کا الزام مخالف احمدیت تحریک کو دے رہی تھی درحقیقت وہ خود حکومت پر عائد ہوتا تھا اور اس کو یہ احساس تک نہ تھا کہ اس

معاملے میں وہ فی الواقع کیا پوزیشن لے رہی ہے۔ مخالفِ احمدیت تحریک تو اٹھی ہی اس بنیاد پر تھی کہ ملت اسلامیہ کی وحدت کو اُن لوگوں کے ہاتھوں پارہ پارہ ہونے سے بچایا جائے جو مرزا غلام احمد صاحب کی نبوت کو نہ ماننے پر تمام کلمہ گو مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں اور ان کی نماز جنازہ پڑھنے تک کو ناجائز کہتے ہیں اور انہیں بیٹی دینا ویسا ہی حرام سمجھتے ہیں جیسا یہودی یا عیسائی کو بیٹی دینا حرام ہے۔ اس کے برعکس حکومت کی اپنی پوزیشن یہ تھی کہ وہ ملت اسلامیہ کے اندر ایسے ایک تفرقہ انگیز گروہ کو زبردستی شامل رکھنے پر مُصر تھی تاکہ وہ مسلم معاشرے میں مسلسل داخلی انتشار برپا کرتا رہے اور ہر روز ایک نئے خاندان اور ایک نئے گھر میں عقائد اور معاشرت کی پھوٹ ڈال دے۔ مگر جس گناہ کی مجرم حکومت خود تھی اس کا الزام اس نے اُلٹا ان لوگوں پر ڈالا جو دراصل اس گناہ سے باز آجانے کا اُس سے مطالبہ کر رہے تھے۔ اس صریح غیر معقول بات کو شائع کرتے وقت حکومت نے ذرا نہ سوچا کہ آخر سارا ملک بے وقوفوں سے تو آباد نہیں ہے، عام لوگ اس طرح کی باتیں سرکاری اعلانات میں پڑھ کر اپنے حکمرانوں کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔

سوم یہ کہ حکومت نے اپنے مذکورۂ بالا اعلانات میں اس تحریک کو بالکل احراریوں کی ایک تحریک قرار دیا، اور اس کا ذکر اس انداز سے کیا گویا کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ کرنے کا مطالبہ مسلمانوں کا کوئی عام قومی مطالبہ نہیں ہے بلکہ محض چند مٹھی بھر احراریوں کا مطالبہ ہے۔ یہ بات بھی ایسی تھی جس نے عوام میں سخت ناراضی پیدا کی۔ اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کا آغاز کرنے والے احرار تھے، مگر واقعہ یہ ہے کہ درحقیقت یہ مسلمانوں کی عام قومی تحریک بن گئی تھی، اور وہ لاکھوں آدمی اس کے ہمدرد اور حامی تھے جو اس سے پہلے احرار کے مخالف اور تحریک پاکستان کے ہمدرد و حامی رہ چکے تھے۔ پبلک نے حکومت کی اس غلط بیانی کو اس رنگ میں لیا کہ جس طرح کبھی انگریزی حکومت ہندوستانیوں کے مطالبۂ آزادی کو محض چند کانگریسیوں کا مطالبہ قرار دے کر عوام کو کچلنے کی کوشش کرتی تھی، اور جس طرح کبھی ہندو لیڈر مطالبۂ پاکستان کو محض چند لیگیوں کا مطالبہ قرار دے کر مسلمانوں کے ایک قومی مطالبے کو نظر انداز کیا کرتے تھے، وہی چال بازی اب ان کی اپنی قومی حکومت ان کے ساتھ کر رہی ہے اور اس طریقے سے

ان کے ایک قومی مطالبے کو محض چند احراریوں کا مطالبہ کہہ کر دبا دینا چاہتی ہے۔

چہارم یہ کہ حکومت نے اپنے ان اعلانات میں اس تحریک کو کچل دینے کا ارادہ جس لہجے اور جن الفاظ میں بیان کیا، اس سے صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ڈائرکٹ ایکشن کو طاقت سے کچلنے کا ارادہ رکھتی ہے، بلکہ یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ اس کو سرے سے قادیانیوں کی مسلمانوں سے علیحدگی کا مطالبہ ہی گوارا نہیں ہے اور یہ کہ وہ ڈائرکٹ ایکشن کے ساتھ اس مطالبے کو بھی کچل دینا چاہتی ہے۔ عوام نے اس کا مطلب یہ لیا کہ حکومت اب سرے سے مطالبہ کرنے کا حق ہی عوام سے چھین لینا چاہتی ہے۔ نیز اس سے مسلمانوں میں یہ بھی عام خیال پیدا ہو گیا کہ حکومت ان کے مقابلے میں علانیہ قادیانیوں کی حمایت پر اتر آئی ہے۔

یہ اسباب تھے جنہوں نے فوری طور پر ڈائرکٹ ایکشن کی آگ پر تیل چھڑکنے کی خدمت انجام دی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر حکومت نے عوام کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کچھ بھی کوشش کی ہوتی، اور سرکاری اعلانات کسی دوسرے معقول اور ٹھنڈے انداز میں مرتب کیے گئے ہوتے، تو عوام کے اندر اتنا اشتعال ہرگز پیدا نہ ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ میری تو یہ قطعی رائے ہے کہ اگر حکومت نے ڈائرکٹ ایکشن شروع کرنے والے لیڈروں کو گرفتار کرنے کے بجائے، یا اس کے ساتھ قادیانی مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے تمام گروہوں کی ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس بلانے کا اعلان کر دیا ہوتا تو سرے سے یہ ہنگامہ برپا ہی نہ ہوتا۔

(۱۶) ۲۷ فروری سے جب کہ ڈائرکٹ ایکشن کا آغاز ہوا، ۴ مارچ تک عوام کے مظاہروں نے اشتعال کے باوجود کہیں بھی بدامنی، لوٹ مار، قتل، آتش زنی، یا تخریب کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔ میں اس زمانے میں نہ صرف لاہور کے حالات سے باخبر رہا ہوں، بلکہ پنجاب کے ہر حصے سے میری جماعت کے کارکن مجھ کو ٹیلیفون کے ذریعے سے حالات بتاتے رہے ہیں۔ میں وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مدت میں عوام نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو وہ اس سے پہلے آج کے حکمرانوں کی قیادت میں خضر حیات خاں کی وزارت توڑنے کے لیے کر چکے تھے۔ ان کے نعروں کی زبان، ان کے جلوسوں کا انداز، ان کے سوانگ، بعض شخصیتوں پر ان کے حملے، حتیٰ کہ ان کا "ڈائرکٹ ایکشن" اور ان کا دفعہ ۱۴۴ توڑنا بجائے خود کتنا ہی قابل اعتراض سہی، لیکن آخر ان میں سے وہ کونسی چیز تھی جو پہلی مرتبہ ہی ان سے ظہور میں آئی ہو؟

یہ سب کچھ وہ اس سے پہلے خود ان لوگوں کی رہنمائی میں کر چکے تھے جو اس تازہ ڈائرکٹ ایکشن کے موقع پر صوبے اور مرکز کی وزارتی کرسیوں پر تشریف فرما تھے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ اب یہ حضرات اپنے ہی سکھائے ہوئے کاموں کو ایسا سخت گناہ سمجھ لیتے کہ ان کے خلاف وہ کچھ کرنے پر اتر آتے جو سر خضر حیات خاں نے نہ کیا تھا۔

(۱۷) ۴ مارچ تک لاہور میں پولیس کا رویہ بہت نرم تھا۔ مگر اس کے بعد یکایک نہایت بیدردی سے پرامن جتھوں پر لاٹھی چارج شروع کر دیے گئے۔ ان لاٹھی چارجوں میں جگہ جگہ نہایت دردناک مناظر دیکھے گئے جن کی وجہ سے شہر کی عام آبادی بھڑک اٹھی اور لاٹھی کا جواب پتھر سے دینے پر اتر آئی۔ اس پر پولیس نے اور خصوصاً بارڈر پولیس نے فائرنگ شروع کیا۔ یہ فائرنگ بالکل اندھا دھند تھا۔ راہ چلتے آدمیوں کو بے قصور مارا گیا۔ دفتروں سے چھٹی پا کر نکلنے والے سرکاری ملازموں، اور تعلیم گاہوں سے نکلتے ہوئے طلبہ تک پر باڑھیں ماری گئیں۔ انسانوں کو اس طرح شکار کیا گیا جیسے کہ وہ جانور یا پرندے ہیں۔ اس پر سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ بڑے بڑے سرکاری دفتروں کے ملازمین، حتیٰ کہ پنجاب سول سکرٹریٹ تک کے ملازمین نے احتجاج کے طور پر ہڑتال کر دی، حالانکہ سرکاری ملازمین کا ان سے زیادہ ذمہ دار کوئی اور طبقہ نہ ہو سکتا تھا۔ ڈاک، تار، ٹیلیفون، ریلوے غرض اکثر و بیشتر محکموں کے آدمیوں نے اس وقت تک کام کرنے سے انکار کر دیا جب تک فائرنگ کا سلسلہ بند نہ کیا جائے۔ شہر کے باشندوں میں ایک تھوڑے سے اونچے طبقے کو چھوڑ کر، کوئی عنصر ایسا باقی نہ رہا جو اس ظلم کے خلاف غصے اور نفرت سے نہ بھر گیا ہو۔ یہ حالات تھے جب بیرے ظلم کی حد تک ۴ مارچ کی شام سے بعض لوگوں نے قتل، لوٹ مار، آتش زنی، اور تخریب کا ارتکاب شروع کیا۔ واقعات کی اس ترتیب کو دیکھتے ہوئے، میں پورے انصاف کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ عوام کی طرف سے بدامنی کے یہ جس قدر بھی افعال ہوئے، ان کی کوئی ذمہ داری ڈائرکٹ ایکشن کی تحریک کے کارکنوں اور رہنماؤں پر نہیں ہے۔ اس کی ذمہ داری تمام تر بارڈر پولیس کے ظلم و ستم پر ہے۔ ڈائرکٹ ایکشن کے لیڈروں نے ان حرکات پر لوگوں کو ہرگز نہیں اکسایا بارڈر پولیس کے ظلم نے لوگوں کو دیوانہ کر کے ان سے یہ حرکات کرائیں۔

(۱۸) ۴ اور ۵ مارچ کی درمیانی شب کو میں نے مولانا مفتی محمد حسن صاحب اور مولانا داؤد غزنوی کی موافقت سے خواجہ ناظم الدین صاحب کو تار دیا کہ پنجاب کے حالات تیزی کے ساتھ بگڑ رہے ہیں، اگر اب بھی کسی گفت وشنید کی گنجائش ہو تو ہمیں گفتگو کا موقع دیجئے۔ خواجہ صاحب کو معلوم تھا کہ مجھے وزرائے کرام کی کوٹھیوں پر حاضری دینے کا کبھی شوق نہیں رہا ہے، اور میں آخری شخص ہو سکتا ہوں جو کبھی کسی وزیر سے خود ملنے کی درخواست کرے۔ انہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ حالات کیسے خراب ہوں گے جب کہ میں نے ان سے یہ درخواست کی ہے۔ مگر انہوں نے میرے تار کا جواب تک دینے کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ ۵ کی صبح کو میں نے ان کو پھر تار دیا کہ حالات ساعت بساعت بگڑ رہے ہیں، میرے تار کا فوراً جواب دیجیے۔ لیکن اس پر کوئی توجہ نہ کی گئی۔ اس سے اُس سنگ دلی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس کے ساتھ پنجاب کے حالات سے عہدہ برآ ہُوا جا رہا تھا۔

(۱۹) ۵ مارچ کی سہ پہر کو گورنر پنجاب مسٹر چندریگر نے گورنمنٹ ہاؤس میں ایک کانفرنس بلائی جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ اس کانفرنس میں تقریباً پچاس اصحاب وخواتین کا اجتماع تھا۔ گورنر صاحب نے اپنی تقریر میں حاضرین سے اپیل کی کہ وہ امن قائم کرنے میں حکومت کی مدد کریں۔ میں نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

بدامنی کی یہ حالت حکومت کی اس غلطی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ اس نے عوام کے مطالبات کو بغیر کوئی وجہ بتلائے ٹھکرا دیا ہے۔ ایک جمہوری نظام میں عوام اس طریقے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر حکومت ان مطالبات کو نہ ماننے کے کچھ معقول وجوہ پیش کرتی، تو اس ملک کے عوام کچھ ایسے سرپھرے نہ تھے کہ وہ خواہ مخواہ دنگے فساد پر اُتر آتے۔ لیکن اس نے سمجھنے اور سمجھانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اور بس یونہی عوام کے منہ پر ان کے مطالبات مار دیئے۔ اس کے بعد لوگوں میں غصہ پیدا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اور اب اس غصے کو فرو کرنے کے لیے آپ کی بارڈر پولیس لوگوں پر اندھا دھند گولیاں برسا رہی ہے۔ ان حالات میں آخر امن کی اپیل کیسے کارگر ہو سکتی ہے۔ امن تو اب وہی طریقوں سے قائم

ہو سکتا ہے: یا تو طاقت سے اپنی قوم کو زبردستی دبا دیجیے، جس کے لیے آپ کو ہماری مدد کی ضرورت نہیں ہے، آپ کے پاس کافی پولیس اور فوج موجود ہے۔ یا اپنی قوم کو راضی کر کے امن قائم کیجیے، جس کی واحد صورت یہ ہے کہ اس کے مطالبات پر گفت و شنید کا دروازہ کھولا جائے۔ یہ دوسری صورت اگر آپ کو پسند ہو تو آپ آج رات ریڈیو پر اعلان کیجئے کہ وزیر اعظم صاحب عوام کے مطالبات پر گفتگو کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ چوبیس گھنٹے کے اندر امن قائم ہو جائے گا۔

میری اس تجویز کو گورنر صاحب نے پسند فرمایا۔ اسی وقت ایک اعلان کا مسودہ تیار کیا گیا اور یہ طے ہوا کہ رات کو وہ ریڈیو پر نشر کیا جائے گا۔ اب یہ مسٹر چندریگر ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ تجویز کس بنا پر رہ گئی۔ اور آخر کار کیوں عوام کو راضی کرنے کی بجائے طاقت ہی سے دبا کر امن قائم کرنے کو ترجیح دی گئی۔

(۳۰) یہ تھے وہ حالات جن میں ۶ مارچ کی دوپہر کو عین نماز جمعہ کے وقت مارشل لا کا اعلان کیا گیا۔ میرے نزدیک یہ اعلان قطعاً غیر ضروری اور بالکل بے جا تھا۔ اول تو جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں، حالات کو خود حکومت کی ہٹ دھرمی، ضد اور سخت غیر دانشمندانہ پالیسی نے اس درجہ بگاڑا تھا، پھر اگر حالات بگڑے بھی تھے، تو ان کو بغیر کسی کشت و خون کے روبراہ لایا جا سکتا تھا بشرطیکہ حکومت آخر وقت پر ہی مسلمانوں کے ایک تلخ معاشرتی مسئلے کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے پر آمادہ ہو جاتی۔ تاہم اگر طاقت ہی کا استعمال کرنا ضروری سمجھا گیا تھا، تو مارشل لا جاری کرنے کے بجائے صرف دفعہ ۱۲۹ ضابطۂ فوجداری کے تحت فوجی امداد لے کر امن قائم کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان میں ۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک بے شمار ہندو مسلم فسادات ہوئے، جن میں سے بعض میں لاہور کے ہنگاموں سے بہت زیادہ قتل و غارت، آتش زنی اور لوٹ مار کے واقعات پیش آئے، مگر کبھی ان فسادات کو روکنے کے لیے مارشل لا جاری نہیں کیا گیا۔ ۱۹۲۱ء سے لے کر گاندھی جی کے آخری Quit India Agitation تک اس برعظیم میں کئی مرتبہ ستیاگرہ اور سول نافرمانی کی تحریکیں اٹھیں، جو کئی بار تشدد تک بھی پہنچ گئیں،

اور موخرالذکر تحریک میں تو بہت بڑے پیمانے پر تخریبی کارروائیاں بھی کی گئیں، مگر اس پوری مدت میں کبھی انگریزی حکومت نے مارشل لا جاری نہیں کیا۔ لاہور کا ہنگامہ ان تحریکوں کے مقابلے میں بہت کم درجے کا تھا۔ اس خدا نے ہنگامے کو فرو کرنے کے لیے مارشل لا جاری کر کے، اور پھر اس کو سوا دو مہینے سے زیادہ مدت تک طول دے کر، حکومت نے بڑی کم حوصلگی اور پست ہمتی کا ثبوت دیا ہے۔ کوئی ایسی حکومت جس کو اپنی طاقت پر اعتماد ہو، وہ چھوٹے چھوٹے غیر معمولی حالات میں اتنی مضطرب نہیں ہو سکتی کہ اتنے بڑے قدم اٹھانے پر اتر آئے۔ میں اس فعل کو حکومت پاکستان کی محض پست ہمتی اور کم حوصلگی ہی نہیں سمجھتا، بلکہ انتہائی سنگ دلی بھی سمجھتا ہوں۔ ابھی حال میں محض ٹراموے کے کرائے بڑھ جانے پر کلکتے میں جو ہنگامے ہوئے وہ لاہور کے ہنگاموں سے بدرجہا زیادہ سخت تھے۔ ان میں اسلحہ اور بم تک پولیس کے مقابلے میں استعمال کیے گئے، اور بڑے پیمانے پر تخریبی کارروائیاں کی گئیں، مگر اس ہنگامے کو دبانے کے لیے ہندوستان کی حکومت نے مارشل لا نہیں لگایا۔ اس سے تھوڑی مدت پہلے پرجا پرشید اور جن سنگھ کی تحریکوں نے بھی وسیع پیمانے پر بدامنی کی حالت پیدا کر رکھی تھی، مگر وہاں اس کا مقابلہ بھی مارشل لا کے ذریعے سے نہیں کیا گیا۔ حکومت پاکستان نے جس بے دردی کا سلوک اپنی قوم کے ساتھ کیا ہے وہ فی الواقع اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

۲۔ اضطرابات کو روکنے اور بعد میں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سول حکام کی تدابیر کا فی یا ناکافی ہونا۔

دوسرے امر تنقیح طلب کے بارے میں مجھے صرف دو باتیں بیان کرنی ہیں :۔

اوّل یہ کہ فروری کے اختتام تک پنجاب گورنمنٹ کی پالیسی ان اضطرابات کو روکنے کی طرف نہیں بلکہ ان کی سرپرستی اور ہمت افزائی کرنے کی طرف مائل تھی۔ اس پالیسی کے محرکات کیا تھے اور عملاً اندر کیا کچھ ہوتا رہا، اس کے متعلق تو میں کوئی بات بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس کا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ بعض خاص خاص محکموں کے سرکاری کاغذات کی جانچ سے عدالت کو اصل حقائق معلوم ہو جائیں۔ مگر بظاہر جو کچھ دیکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان اضطرابات کا پورا مواد علانیہ حکومت پنجاب کی ناک کے نیچے پکتا رہا، اور اس حکومت نے جس کی عملداری میں فسا

ذراسی باتوں پر پریس ایکٹ، سیفٹی ایکٹ اور دفعہ ۱۴۴ حرکت میں آجایا کرتے ہیں، اس کام میں ذرا مداخلت نہ کی۔ پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس کام کو فروغ دینے میں زیادہ تر وہی لوگ پیش پیش تھے جن کے حکومت پنجاب سے مخصوص تعلقات معلومِ عوام ہیں اور جو پنجاب کے پچھلے انتخابات میں مسلم لیگ پارٹی کے سرگرم حامی رہ چکے ہیں۔ مجھے پنجاب کے بعض علاقوں سے یہاں تک بھی اطلاعات ملی ہیں کہ فروری کے آخر تک اضلاع کے حکام خود اس تحریک میں حصہ لینے کے لیے لوگوں کو ابھارتے رہے ہیں

دوم یہ کہ جب ڈائرکٹ ایکشن عملاً شروع ہو گیا تو دو تین دن کے اندر ہی یکایک حکومت پنجاب کی پالیسی بدل گئی اور اس نے یک لخت ویسی سختی شروع کر دی جو کافی سے بہت زیادہ تھی۔ اس نے صرف قانون شکنی کرنے والوں ہی پر نہیں بلکہ بالکل بے تعلق عوام پر وحشیانہ ظلم ڈھائے، جن کی وجہ سے مختلف مقامات پر عام آبادی مشتعل ہو گئی۔ پھر اپنی بھڑکائی ہوئی اس آگ کو دیکھ کر بہت جلدی سول حکام کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور انہوں نے معاملات فوج کے حوالے کرنے میں بڑی بے صبری سے کام لیا۔

۳۔ اضطرابات کی ذمہ داری

جو حالات میں نے اوپر بیان کیے ہیں ان کی بنا پر میرے نزدیک ان اضطرابات اور ہنگاموں کی ذمہ داری چار فریقوں پر بالکل برابر برابر تقسیم ہوتی ہے:۔

۱۔ قادیانی جماعت، جس نے مسلمانوں میں شامل رہ کر اپنی تکفیر، تبلیغ، جداگانہ تنظیم، معاشرتی مقاطعے اور معاشی کشمکش سے مسلمانوں کے اندر پچاس برس سے مسلسل ایک تفرقہ برپا کر رکھا تھا، اور جس نے قیام پاکستان کے بعد اپنے خطرناک منصوبوں کے اظہار، اور اپنی جنگ جویانہ باتوں سے عوام کو اپنے خلاف پہلے سے زیادہ مشتعل کر دیا۔ حالانکہ اگر وہ بہائیوں کی پالیسی اختیار کر کے اپنا مذہب الگ بنا لیتے اور مسلمانوں کے معاشرے میں شامل ہو کر تفرقہ انگیزیاں نہ کرتے تو مسلمان اسی طرح ان کے ساتھ رواداری برتتے جس طرح وہ عیسائیوں، ہندوؤں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں سے برتتے ہیں۔

۲- وہ جماعتیں جنہوں نے لوگوں کو ڈائرکٹ ایکشن کا رستہ دکھایا۔ حالانکہ یہ بالکل بے موقع اور غیر ضروری تھا۔ اور مسلم پبلک کے مطالبے کو منوانے کے لیے آئینی ذرائع کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔

۳- مرکزی حکومت، (جس سے میری مراد مرکزی وزارت ہے) جس نے مئی ۵۲ء سے مارشل لا کے اعلان تک مسلسل اپنی غیر دانشمندانہ پالیسی سے معاملات کو بگاڑنے اور آخر کار ہزارہا بندگان خدا کی تباہی کا سامان کیا۔

۴- صوبائی حکومت، (اور اس سے بھی میری مراد صوبائی وزارت ہے) جس کی دورخی پالیسی نے ان حالات کو خراب کرنے میں خاص حصہ لیا ہے۔

ان چاروں فریقوں میں سے کسی کا گناہ بھی دوسرے سے کم نہیں ہے۔ اور یہ سب اس کے مستحق ہیں کہ ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ اگر یہاں نہ چلے گا تو انشاءاللہ خداوند عالم کی آخری عدالت میں چل کر رہے گا۔

۴- قادیانی مسئلے کے متعلق میرا اور جماعت اسلامی کا طرز عمل

اس مسئلے پر میری پالیسی اور میری رہنمائی میں جماعت اسلامی کی پالیسی تین اجزاء پر مشتمل رہی ہے:

اوّل یہ کہ میں قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ کرنے کا مطالبہ بالکل برحق سمجھتا ہوں اور تمام جائز ذرائع سے اس کو منوانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

دوم یہ کہ میں نے کبھی ڈائرکٹ ایکشن کی تائید نہیں کی ہے، اپنی امکانی حد تک اس کو روکنے کی پوری کوشش کی ہے، میری جماعت نے خود اس میں کوئی حصہ نہیں لیا، اور جماعت کے جن افراد نے جماعتی ضبط کو توڑ کر اس میں حصہ لیا ان کو جماعت سے الگ کر دیا گیا۔

سوم یہ کہ میں نے اس قضیے کے آغاز سے لے کر مارشل لا کے نفاذ تک حکومت کو اُس غیر دانشمندانہ پالیسی سے باز رکھنے کی مسلسل کوشش کی ہے جو آخر کار تباہ کن ثابت ہو کر رہی۔

میں ان تینوں اجزا کی تشریح کر کے اپنی پوزیشن کی وضاحت کروں گا۔

(۱) امر اوّل کے متعلق گزارش ہے کہ میں نے جس چیز کو حق سمجھا ہے دلائل کی بنا پر سمجھا ہے اور اپنے دلائل پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ بالفرض اگر کسی کے نزدیک وہ چیز حق نہیں ہے جسے میں

حق سمجھتا ہوں، تو وہ اپنے دلائل دے سکتا ہے۔ مگر ایک جمہوری نظام میں کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا، خواہ وہ حکومت ہی کیوں نہ ہو، کہ وہ کسی معاملے میں مجھ کو ایک رائے رکھنے سے، یا اپنی رائے کو معقولیت کے ساتھ بیان کرنے سے، یا اس کی تائید میں رائے عام کو ہموار کرنے کی جائز کوشش سے، یا اپنی رائے منوانے کی آئینی تدابیر استعمال کرنے سے باز رکھے۔ محض یہ بات کہ جو رائے میں رکھتا ہوں وہی رائے کچھ دوسرے لوگ بھی رکھتے تھے اور انہوں نے اس رائے کو منوانے کے لیے غیر آئینی تدابیر اختیار کیں، مجھے قابلِ الزام بنا دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ جب تک میں خود اپنے خیالات کی ترویج کے لیے، یا اپنے کسی مطالبے کو منوانے کے لیے تشدد یا قانون شکنی کا طریقہ اختیار نہیں کرتا، میں یقیناً اپنے جائز قانونی حدود کے اندر ہوں۔ اس صورت میں نہ تو میرے دوسرے ہم خیالوں کے غلط فعل کی کوئی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے اور نہ اپنے خیالات کی ترویج کے لیے جائز ذرائع استعمال کرنے کا حق مجھ سے سلب کیا جا سکتا ہے۔ میں اس وقت تک بھی یہ نہیں سمجھ سکا ہوں کہ اگر کوئی شخص معقول وجوہ اور دلائل کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہے کہ قادیانی گروہ مسلم ملت کا ایک جزو نہیں ہے اور اس کی تائید میں وہ خالص علمی استدلال کے ساتھ سنجیدہ مہذب زبان میں بحث کرتا ہے، یا اگر کوئی شخص مسلمانوں کے اندر قادیانی گروہ کے شمول کو مسلم ملت کی وحدت و سالمیت کے لیے نقصان دہ سمجھتا ہے اور اپنے ملک کی دستور ساز مجلس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ دستورِ مملکت میں اس گروہ کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دے دے، تو آخر وہ جرم کیا ہے جس کا وہ مرتکب ہے پھر کیوں آج ہر اس شخص کی ٹانگ گھسیٹی جا رہی ہے جس نے کبھی قادیانی مسئلے پر گفتگو کی ہے، قطع نظر اس سے کہ عملاً اس کا پچھلے اضطرابات سے کوئی تعلق رہا ہو یا نہ رہا ہو۔

حال میں بعض ذمہ داران حکومت کی طرف سے یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ ملک کی فلاح و بہبود کے لیے "رواداری" کی سخت ضرورت ہے، اور قادیانی مسئلے پر گفتگو یا قادیانیوں کی علیحدگی کا مطالبہ "ناروا داری" ہے، اس لیے حکومت اس کو بجائے خود قابلِ اعتراض سمجھتی ہے اور اس کا استیصال کرنا چاہتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ رواداری اور ناروا داری کے الفاظ کا ایک عجیب استعمال، اور ان کے مفہوم کا بالکل ہی ایک نرالا تصور ہے، جسے حاکمانہ طاقت سے ہم پر ٹھونسنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اگر کسی نے یہ کہا ہوتا کہ فلاں گروہ کو ملک میں جینے نہ دو، یا اس کے شہری حقوق سلب کر لو، یا اس کو اپنے مذہب پر عقیدہ اور عمل رکھنے سے زبردستی روک دو، تو بلاشبہ یہ ناروا داری ہوتی اور اس طرح کے کسی خیال کی ترویج بجائے خود ایک برائی ہوتی، جس کے استیصال کو اپنی پالیسی قرار دینے میں حکومت بالکل حق بجانب تھی۔ لیکن یہاں جس معاملے پر لفظ ناروا داری کو چسپاں کیا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسے گروہ کو اپنے معاشرے کا جزو بنا کر نہیں رکھنا چاہتے جو ایک طرف ان کے معاشرے میں شامل بھی ہے اور دوسری طرف تمام مسلمانوں کو کافر کہہ کر، اور ان سے معاشرتی مقاطعہ کر کے، اور ان کے مقابلے میں اپنی جماعتی تنظیم اور معاشی جتھہ بندی الگ کر کے، اپنی تبلیغ سے پیہم اس معاشرے میں اندرونی اختلال بھی برپا کرتا جا رہا ہے۔ ایسے ایک گروہ کی علیحدگی کے مطالبے کو "ناروا داری" قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے ارباب حکومت کے شاداب ذہن میں "رواداری" کا مطلب اپنی تخریب اور اپنے شیرازے کی پراگندگی کے اسباب کو خود اپنے اندر پرورش کرنا قرار پایا ہے۔ تصورات کی عجائب آفرینی کا یہی حال رہا تو بعید نہیں کہ کل اسی ناروا داری کے الزام میں ہر وہ شخص ہسپتال سے جیل بھیج دیا جائے جو اپنڈے سائٹس کا اپریشن کرانا چاہتا ہو۔

پچھلے دنوں حکومت کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس وقت ملک میں قادیانی مسئلے پر ہنگامہ برپا تھا، اس وقت اس مسئلے میں مسلمانوں کے مطالبے کی صحت کو دلائل سے ثابت کرنا بجائے خود قابل اعتراض تھا، کیونکہ اس سے ہنگامے کو تقویت پہنچتی تھی۔ میری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر پبلک کا ایک مطالبہ اپنی جگہ بالکل معقول بنیادوں پر مبنی ہو، اور حکومت سراسر ضد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر بغیر کوئی معقول وجہ بتلائے اس مطالبے کو رد کر دے، اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ حکومت کی اس غلط پالیسی کی وجہ سے ملک میں تباہی آ رہی ہے، تو آخر کیوں نہ میں عین وقت پر اس تباہی کو روکنے کے لیے حکومت کے موقف کی غلطی دلائل سے ثابت کروں؟ کیا حکومت یہ چاہتی ہے کہ جب وہ غلطی کر رہی ہو اس وقت کوئی اس کی غلطی کو غلطی نہ کہے؟ کیا حکومت کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل بے جا اور ناروا طریقے سے لوگوں کے سر توڑتی رہے اور ملک میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا موجود نہ ہو، جو اسے

انصاف اور معقولیت کی بات بتانے والا ہو؟ میرے علم اور میری قوت بحث و استدلال کا آخر فائدہ ہی کیا تھا اگر میں اُسے ٹھیک اس وقت استعمال نہ کرتا جب کہ تباہی کو روکنے کے لیے اس کے استعمال کی ضرورت تھی۔ جس مسئلے کو حکومت نے صحیح طریقے سے نہ سمجھ کر اور حل نہ کر کے ملک میں ایک فتنہ برپا کرا دیا تھا، اس کی حقیقت اگر میں اُس وقت نہ سمجھاتا جب کہ فتنہ اُٹھتا نظر آ رہا تھا، تو آخر اس کے سمجھانے کا وقت اور کونسا ہو سکتا تھا؟ میری اس کوشش کو اگر حکومت فتنے میں امداد کرنے سے بجا طور پر تعبیر کر سکتی تھی، تو صرف اس صورت میں جبکہ میں نے اپنی کسی تحریر میں علمی استدلال اور سنجیدہ بحث کے انداز سے ہٹ کر کوئی ایک فقرہ یا لفظ بھی ایسا استعمال کر لیا ہوتا جسے اشتعال انگیز یا منافرت انگیز کہا جا سکتا ہو۔ لیکن میں چیلنج کے ساتھ کہتا ہوں کہ میری کسی تحریر میں، جو میں نے قادیانی مسئلے کے متعلق لکھی ہے، ایسا کوئی فقرہ یا لفظ نکال کر نہیں دکھایا جا سکتا۔

اس سلسلے میں عدالت سے میری درخواست یہ ہے کہ وہ اصولی طور پر دو چیزوں کا فرق واضح کر دے۔ ایک چیز ہے قادیانیوں کی علیحدگی کا آئینی مطالبہ۔ دوسری چیز ہے اس مطالبے کو منوانے کے لیے کوئی غیر آئینی طریقہ اختیار کرنا۔ کیا ان دونوں کو ایک ہی حیثیت میں رکھا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں رکھا جا سکتا تو اس حقیقت کو پوری طرح واضح ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ ان دونوں کو خلط ملط کر کے بہت سے ان لوگوں کو مبتلائے مصیبت کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے جنہوں نے اس مطالبے کو منوانے کے لیے کبھی غیر آئینی طریقہ اختیار نہیں کیا، مگر آئینی اور جمہوری طریقوں سے وہ اس کو منوانے کی ضرور کوشش کرتے رہے ہیں۔

(۲) امر دوم کے متعلق میں واقعات کو ان کی صحیح صورت میں تاریخی ترتیب کے ساتھ عدالت کے سامنے رکھ دیتا ہوں، پھر یہ رائے قائم کرنا عدالت کا کام ہے کہ ڈائرکٹ ایکشن کے ساتھ میرا اور میری جماعت اسلامی کا تعلق کیا تھا اور کیا نہ تھا۔

مئی ۱۹۵۲ء میں جب احرار نے قادیانی مسئلے پر ایجی ٹیشن کا آغاز کیا، اُس وقت جماعت اسلامی کی رائے یہ تھی کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ کر کے ایک مستقل اقلیت قرار دینے کا مطالبہ بجائے خود

صحیح ہے، مگر اس وقت جبکہ ملک کا دستور بن رہا ہے، مسلمانوں کی توجہ کسی ضمنی مسئلے کی طرف پھیر دینا درست نہیں ہے۔ اس وقت تمام کوششوں کو ایک صحیح اسلامی دستور بنوانے پر مرکوز کیے رکھنا چاہیے اور دستور ہی میں قادیانی مسئلے کو بھی حل کرانا چاہیے۔ یہی رائے جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے اپنے جون ۱۹۵۲ء کے ایک ریزولیوشن میں ظاہر کی تھی۔

جولائی ۱۹۵۲ء میں احرار نے لاہور میں تمام مذہبی جماعتوں کی ایک کنونشن منعقد کی اور اس میں جماعت اسلامی کو بھی دعوت دی۔ جماعت کی طرف سے مولانا امین صاحب اور ملک نصراللہ خاں صاحب عزیز اس میں شرکت کے لیے بھیجے گئے اور انہوں نے وہاں جماعت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کر دی۔ اس کنونشن میں پنجاب کے لیے ایک مجلس عمل بنائی گئی اور اس میں جماعت اسلامی کو بھی دو نشستیں پیش کی گئیں۔ مگر جماعت نے اس مجلس میں شرکت قبول نہ کی۔

مئی سے جولائی تک پنجاب میں جو اضطرابات رونما ہوئے ان کو اور خصوصاً ملتان کے ہنگامے کو جماعت اسلامی نے سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھا، اور اس کے دو وجوہ تھے: ایک یہ کہ اس ہنگامہ خیزی سے عوام کی ذہنیت بگڑ رہی ہے اور عوامی تحریکات کا رُخ شورش کی طرف مائل ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ملک میں کسی سنجیدہ اور معقول تحریک کے لیے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ ایک ضمنی مسئلے نے عوام کی توجہ کو دستور کے بنیادی مسئلے کی طرف سے ہٹا دیا ہے، اور اس حالت میں اگر کوئی غلط دستور بن جائے تو اس کا خمیازہ ملک کو ایک مدت دراز تک بھگتنا پڑے گا۔ ان دونوں پہلوؤں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ہم نے اگست ۱۹۵۲ء کے آغاز میں یہ طے کیا کہ ہم اسلامی دستور کے لیے جو جدوجہد کر رہے ہیں، اس کے مطالبات میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ بھی شامل کر لیا جائے۔ اس تدبیر سے ہمارے پیش نظر دو مقصد تھے: ایک یہ کہ عوام کے لیے قادیانی مسئلے پر الگ جدوجہد کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے اور ان کی توجہ دستور کے مسئلے پر مرکوز کی جا سکے۔ دوسرے یہ کہ عوام کی ذہنیت کو شورش اور ہنگامے سے ہٹا کر آئینی جدوجہد کی طرف موڑ دیا جائے۔ ان دونوں مقاصد کو میں نے اپنے ایک بیان میں واضح کر دیا تھا، جو روزنامہ "تسنیم" کی ۴ اگست ۱۹۵۲ء کی

اشاعت میں شائع ہوا۔

اگست کے اواخر یا ستمبر کے اوائل میں مولانا عبدالحلیم صاحب قاسمی ناظم جمعیۃ علماء اسلام پنجاب مجھ سے ملے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ آل مسلم پارٹیز کنونشن نے پنجاب میں جو مجلس عمل بنائی ہے، اس میں ایسے عناصر کا غلبہ ہے جن کا رجحان قادیانی مسئلے کو شورش اور ہنگامے کے ذریعے سے حل کرانے کی طرف ہے، اور ہم لوگ جو اس تحریک کو غلط رُخ پر جانے سے روکنا چاہتے ہیں قلیل تعداد میں ہیں، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی مجلس عمل میں اپنے نمائندے بھیجنا قبول کرے، تاکہ ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں اور ہم اس خطرے کی روک تھام کر سکیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی اس بات میں وزن ہے اور اسی بنیاد پر میں نے جماعت اسلامی کے دو نمائندے مجلس عمل کے لیے نامزد کیے جنہوں نے مجلس کے دوسرے سنجیدہ عناصر کے ساتھ تعاون کر کے متعدد مواقع پر غلط رجحانات کا سدِّ باب کیا۔

واقعات سے ثابت ہے کہ اگست سے لے کر جنوری تک پھر کوئی شورشی تحریک قادیانی مسئلے کے متعلق نہ اُٹھ سکی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس اصلاح حال میں جماعت اسلامی کی مذکورہ بالا دو تدبیروں کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔

دسمبر ۵۲ء میں مجلس دستور ساز کی (Basic Principle Committee) کی رپورٹ شائع ہوئی اور اس میں قادیانی مسئلے کا کوئی حل تجویز نہیں کیا گیا تھا۔ اس فروگذاشت نے اُن کوششوں کو سخت نقصان پہنچایا، جو ہماری طرف سے اس تحریک کو آئینی طریقۂ کار کا پابند رکھنے کے لیے کی جا رہی تھیں۔

جنوری ۵۳ء کے دوسرے ہفتے میں پاکستان کے ۳۳ سربرآوردہ علماء کا ایک اجتماع (B P C Report) پر غور کرنے کے لیے کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع کا ایک رکن میں بھی تھا۔ علماء نے اس اجتماع میں رپورٹ کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس کے دستوری خاکے میں بہت سی ترمیمات و اصلاحات تجویز کیں، جن میں سے ایک اصلاح یہ بھی تھی کہ رپورٹ میں جن اقلیتوں کے لیے جداگانہ انتخاب اور نشستوں کا تعین تجویز کیا گیا ہے، ان میں قادیانیوں کو بھی شامل کر دیا جائے۔

اسی ماہ جنوری کے وسط میں کراچی ہی میں پورے پاکستان کی ایک آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقد ہوئی، جس کا مقصد "تحفظِ ختم نبوت" کے مسئلے پر غور کرنا تھا۔ مجھے بھی اس میں دعوت دی گئی تھی۔ میں نے کنونشن کی سب جیکٹس کمیٹی میں یہ تجویز پیش کی کہ جب علماء نے (B.P.C. Report) پر اپنی ترمیمات میں قادیانی مسئلے کے آئینی حل کو شامل کر لیا ہے تو اس مسئلے کے متعلق کوئی علیحدہ جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صرف وہی ایک جدوجہد تمام مقاصد کے لیے کافی ہے جو علماء کی تجویز کردہ ترمیمات کو منظور کرانے کے لیے کی جائے گی۔ طویل مباحثے کے بعد سب جیکٹس کمیٹی نے میری اس رائے کو مان لیا مگر کھلے اجلاس میں کنونشن نے اسے رد کر دیا۔

اس کے بعد میں نے کنونشن میں دوسری تجویز یہ پیش کی کہ پورے پاکستان کی ایک مرکزی مجلسِ عمل بنائی جائے اور صرف وہی "تحفظِ ختم نبوت" کے لیے پروگرام بنائے اور دوسرے اقدامات تجویز کرنے کی مجاز ہو۔ اس مجلس کے سوا کسی اور کو بطورِ خود کوئی قدم اٹھانے کا اختیار نہ ہونا چاہیے۔ میری یہ تجویز مان لی گئی اور پندرہ ارکان کی ایک مرکزی مجلسِ عمل بنا دی گئی، جن میں سے آٹھ ارکان اسی وقت منتخب کر لیے گئے، اور طے ہوا کہ سات ارکان بعد میں اس کے اندر شامل کیے جائیں۔ جو ارکان وہاں منتخب کیے گئے تھے ان میں سے ایک میں بھی تھا۔

اس مرکزی مجلسِ عمل کا کوئی اجلاس ۲۶ فروری تک نہیں ہوا۔ اس میں جو سات مزید ارکان شامل کیے جانے تھے، وہ بھی شامل نہیں کیے گئے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ مجلس کی ترکیب ہی مکمل نہیں ہوئی۔ اور جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں، کنونشن کے مقصد پر عمل کرنے کے لیے پروگرام بنانے کی مجاز صرف یہی مجلس تھی۔ اس لیے ۱۸ جنوری سے ۲۶ فروری تک کنونشن کی ممبر جماعتوں میں سے بعض نے جتنی کارروائیاں بھی کیں، وہ سب خلافِ ضابطہ تھیں۔ ۲۲ جنوری کو جو وفد وزیر اعظم سے ملا وہ اِن چند جماعتوں کا خود ساختہ تھا، کنونشن نے یا مرکزی مجلسِ عمل نے اس وفد کو ترتیب نہیں دیا۔ اس وفد نے وزیر اعظم کو ایک مہینے کا جو نوٹس دیا، اور مہینہ گزرنے کے بعد ڈائرکٹ ایکشن شروع کرنے کا جو اعلان کیا، اس کے لیے کسی نے اس کو مجاز نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد پنجاب آکر ان جماعتوں نے ڈائرکٹ ایکشن

۴ اور ۵ مارچ کو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا، اور اس نے ڈائرکٹ ایکشن سے جماعت اسلامی کی قطعی بے تعلقی کا فیصلہ کیا۔ اسی موقع پر میں نے پنجاب کے تمام اضلاع سے جماعت کے ذمہ دار کارکنوں کو لاہور بلا کر ہدایات دیں کہ وہ جماعت کے ارکان کو اس تحریک سے بالکل علیحدہ رکھیں۔ اس کے بعد صرف دو مقامات سے مجھے اطلاع ملی کہ جماعت کے دو ارکان نے ڈائرکٹ ایکشن میں حصہ لیا ہے اور میں نے فوراً ان دونوں کو جماعت سے خارج کر دیا۔

اس پوری مدت میں میرے یا جماعت اسلامی کے کسی فعل سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان اضطرابات کی ذمہ داری میں ہمارا کوئی ادنیٰ سا حصہ بھی ہے۔ اس کے باوجود جس طرح مجھے اور جماعت کے بہت سے ارکان کو خواہ مخواہ اس کی ذمہ داری میں گھسیٹا گیا ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک شخص سڑک سے ہٹ کر کھیتوں میں جا کھڑا ہو اور دوسرا شخص وہاں موٹر لے جا کر اس کو ٹکر دے۔

(۳) امر سوم کے متعلق میں اپنے وہ تمام بیانات اور مضامین اور جماعت اسلامی کے وہ سب ریزولیوشن جو قادیانی مسئلے سے متعلق جون ۱۹۵۲ء سے ۶ مارچ ۱۹۵۳ء تک شائع ہوئے ہیں، اس بیان کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں، ان کو دیکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ میں نے اور میری جماعت نے کامل دس مہینے تک کس کس طرح حکومت کو اس مسئلے کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اسے تدبر و معاملہ فہمی کے ساتھ حل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ میں ان تحریروں کے متعلق خود کچھ کہنے کے بجائے اس امر کا فیصلہ عدالت پر چھوڑتا ہوں کہ جس شخص اور جماعت کی یہ تحریریں ہیں، اس کی نیت آیا اس ملک کے ایک اجتماعی مسئلے کو معقولیت کے ساتھ حل کروانے کی تھی یا کسی قسم کا فتنہ برپا کرنے کی۔ اور یہ کہ وہ لوگ کس ذہنیت کے مالک تھے جنہوں نے آخر وقت تک اس مسئلے کو ناخن تدبیر سے حل کرنے کے بجائے طاقت ہی سے دبانے پر اصرار کیا اور آخر کار کشت و خون برپا کر کے ہی چھوڑا۔

اس بیان کو ختم کرنے سے پہلے میں یہ بات بھی عدالت کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ میں نے جس طرح حکومت کو اس کی غلط پالیسی سے، اور ڈائرکٹ ایکشن کے لیڈروں کو ان کے غلط فیصلے سے

روکنے کی آخر وقت تک کوشش کی ہے، اسی طرح میں قادیانیوں کو بھی ان کی غلطی سمجھانے اور صحیح مشورہ دینے کی پوری کوشش کرتا رہا ہوں۔ گزشتہ ماہ جولائی میں شیخ بشیر احمد صاحب ایڈووکیٹ لاہور، مولوی ابوالعطا جالندھری اور جناب شمس صاحب کو میں نے سمجھایا تھا کہ جو باتیں انگریزی دور میں نبھ گئیں وہ اب اس آزادی کے دور میں، جب کہ جمہوری حکومت کے اختیارات مسلم اکثریت کے ہاتھ میں ہیں، زیادہ دیر تک نہ نبھ سکیں گی۔ لہٰذا قبل اس کے کہ آپ کی جماعت اور مسلمانوں کے تعلقات کی تلخی میں مزید اضافہ ہو، آپ لوگ معاملہ فہمی اور تدبر سے کام لیتے ہوئے دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کریں: یا تو اپنے عقائد اور طرز عمل میں ایسی ترمیم کیجیے کہ جس سے مسلمان آپ کو اپنے اندر شامل رکھنے پر راضی ہو سکیں، یا پھر خود ہی مسلمانوں سے الگ ہو کر ایک مستقل اقلیت کی حیثیت سے اپنے لیے وہی حقوق حاصل کر لیجیے جو پاکستان میں دوسری اقلیتوں کو حاصل ہیں۔ مگر افسوس کہ انہوں نے میرے اس دوستانہ مشورے کو قبول نہ کیا۔ پھر مارشل لا کے زمانے میں ۲۰ مارچ کے قریب خواجہ نذیر احمد صاحب ایڈووکیٹ لاہور سے میری ملاقات ہوئی اور ان سے میں نے کہا کہ آپ مرزا بشیر الدین محمود صاحب سے خود جا کر ملیں اور ان کو مشورہ دیں کہ اگر وہ واقعی مسلمانوں سے الگ ہونا پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ ان کی جماعت اس ملت کا ایک جزو بن کر رہے، تو وہ صاف الفاظ میں حسب ذیل تین باتوں کا اعلان کر دیں:۔

(۱) یہ کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معنی میں خاتم النبیین مانتے ہیں کہ حضور کے بعد کوئی اور نبی مبعوث ہونے والا نہیں ہے۔

(۲) یہ کہ وہ مرزا غلام احمد صاحب کے لیے نبوت یا کسی اور ایسے منصب کے قائل نہیں ہیں جسے نہ ماننے کی وجہ سے کوئی شخص کافر ہو۔

(۳) یہ کہ وہ تمام غیر احمدی مسلمانوں کو مسلمان مانتے ہیں اور احمدیوں کے لیے ان کی نماز جنازہ پڑھنا ان کے امام کی اقتدا میں نمازیں ادا کرنا، ان کو بیٹیاں دینا جائز سمجھتے ہیں۔

میں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ اگر آج مرزا صاحب ان باتوں کا واضح طور پر اعلان کر دیں

تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ سارا جھگڑا فوراً ختم ہو جائے گا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب میری اس تجویز کو لے کر مسٹر چندریگر سے ملے اور انہوں نے نہ صرف اس سے اتفاق کیا بلکہ اس تجویز میں خود بھی بعض الفاظ کا اضافہ کیا۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ خواجہ صاحب نے "ربوہ" جا کر اس پر مرزا صاحب سے گفتگو کی، اور مرزا صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی جماعت کی مجلس شوریٰ بلا کر اس پر غور کریں گے۔ مگر اسی دوران میں میری گرفتاری عمل میں آ گئی، اور بعد کی کوئی اطلاع مجھے نہ مل سکی۔ غالباً مرزا صاحب نے یہ دیکھ کر کہ حکومت پوری طاقت سے ان کی حمایت اور مسلمانوں کی سرکوبی کر رہی ہے، میری اس تجویز کو درخور اعتنا نہ سمجھا ہوگا۔ کیونکہ اس وقت تک ان کی طرف سے ایسا کوئی اعلان شائع نہیں ہوا جس میں ان تین باتوں کی تصریح ہو۔

بہرحال میری ان کوششوں سے یہ بات عیاں ہے کہ میں نے اپنی حد تک اس نزاع کے تینوں فریقوں کو مصالحت پر آمادہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ مگر ہر فریق نے مجھے ان کوششوں کی وہ بڑی سے بڑی سزا دی جو وہ دے سکتا تھا۔ ایک فریق نے بھرے جلسوں میں متعدد بار عوام کو میرے خلاف بھڑکایا، یہاں تک کہ ۶ مارچ کی صبح کو ایک مشتعل مجمع میرے مکان پر چڑھ آیا۔ دوسرے فریق نے پانچ واجب القتل "خونی ملاؤں" میں مجھے بھی شمولیت کا شرف عطا کیا۔ تیسرے فریق نے مجھے گرفتار کر کے میرا کورٹ مارشل کرایا اور مجھے پہلے سزائے موت اور پھر چودہ سال کی قید بامشقت کی سزا دلوائی۔

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا بیان میں جو باتیں درج کی گئی ہیں وہ میری بہترین اطلاع، جس پر میں یقین کرتا ہوں، کے مطابق صحیح و درست ہیں۔

ابوالاعلیٰ مودودی

۲۹ جولائی ۵۳ء

سنٹرل جیل لاہور

Superintendent Central Jail
Lahore

سُنّتِ رسُول

شیخ مصطفیٰ السباعی

احادیث کی مختلف اقسام صحیح، حسن اور ضعیف کی تمیز اور پہچان کے لیے جس طرح علماء نے قواعد و ضوابط مرتب کیے، اسی طرح موضوع احادیث کی جانچ پرکھ کے لیے بھی کچھ اصول و ضوابط وضع کیے، جن کی مدد سے اس قسم کی احادیث کا کھوٹ بڑی آسانی کے ساتھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے ہم واضعین حدیث کی اقسام اور وضع کے اسباب پر بحث کر چکے ہیں، اب ہم وضع پر دلالت کرنے والی علامات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ان علامات کی دو قسمیں ہیں:-

(۱) سند کی علامات (۲) متن کی علامات۔

سندِ حدیث میں وضع کی بے شمار علامات ہیں، ان میں سے چند خاص علامات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ پہلی علامت یہ ہے کہ راوی دروغ گوئی میں مشہور ہو اور وہ جس حدیث کی روایت کر رہا ہو، وہ کسی ثقہ راوی کی زبانی نہ سنی گئی ہو۔ علماء نے ان کذابوں کی چھان بین اور ان کے تاریخی حالات کی جستجو و تلاش میں بڑی کد و کاوش کی ہے اور ان کی غلط بیانی کے پیچھے اس طرح ہاتھ دھو کر پڑے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی ان کے نقد سے نہیں بچ سکا۔

۲۔ دوسری علامت یہ ہے کہ واضع حدیث خود وضع کا اعتراف کر لے، جس طرح ابو عصمہ بن نوح بن ابو مریم نے سورتوں کے فضائل کی احادیث اور عبدالکریم بن ابوالعوجار نے چار ہزار حلال و حرام کرنے والی احادیث وضع کرنے کا اعتراف کیا۔

۳۔ تیسری علامت یہ ہے کہ راوی کسی ایسے شیخ سے حدیث بیان کر رہا ہو، جس سے اس کی ملاقات ثابت نہ ہو، یا راوی شیخ کی وفات کے بعد پیدا ہوا ہو، یا اس جگہ کبھی پہنچا ہی نہ ہو جہاں حدیث سننے کا دعویٰ کر رہا ہو، جیسا کہ مامون بن احمد ہروی نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے ہشام بن عمار سے حدیث سنی ہے